شبہات اور جوابات

مَیں نے اپنے گذشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی توضیح مقاصد میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

اعتراض:۔ آپ نے سیاسی کام کرنے کے اکثر اُن طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لئے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہ عمل" میں خود جو طریق کار مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اندازاً کتنی مدت درکار ہوگی۔ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو جائیں؟

جواب :- فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور "ان کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو اُن وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوتِ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں ❖

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجئے اور ایک ایک جزء کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجئے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں:-

۱- میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار

رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں ——— یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے ۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے ۔ میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لئے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا ۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں ۔ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی) ۔

۲ ۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو، اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقاء کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ——— میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا ۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے ۔

۳ ۔ مذکورہ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے ۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے ۔ اس لئے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے ؟ اصول اسلام

کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ——— کیا آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وہ وجوہ ارشاد ہوں! اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیئے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لئے یکساں مہلک ہیں ——— آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کا خطرہ میں نے ظاہر کیا۔ یا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حبِ وطن یا حبِ نفس

کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیئے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے ——— اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجئے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لئے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے"، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست

نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لئے صدر اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دین داری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لئے اجتماعی جدوجہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لئے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کئے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لئے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔

اعتراض:- آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رُکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادرانِ وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکے سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ "بھائیو ذرا ٹھیر جاؤ، ہمیں بھی تیار ہو لینے دو، پھر جنگ شروع کرنا"۔ ہماری ایسی آواز کو کون سُن سکتا ہے اور اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی کان دھر سکتا ہے۔

جواب:- یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اُس وقت تک کے لئے ملتوی ہو جائے گی، یا ہو جانی چاہیے، جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقار کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رُک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریکِ جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر لیں جو شریکِ جنگ ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

ہر شخص جسے خدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف

اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق و پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مقابلہ کا کیا انجام ہوگا؟ ہمارا حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دوسرے گروہ کا کچھ اور ——— ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق ہی نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام ہی سن کر "فرقہ پرستی" "ٹوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے جد و جہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اس کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کیلئے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنے کے لئے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہم کو سبک کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری کو ساتھ لئے ہوئے آپ جدھر بھی جائیں گے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا، اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کر سکیں گے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اس کا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ

ہتھیاروں پر صیقل بھی ہو گا۔ اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہو گا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہو گا۔

اعتراض: آپ نے اپنے مضمون "آنے والا انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متأثر ہونے والے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اور نہ اس کا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یکدل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں اور کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ کا مصداق بن کر دُنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور دُنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نورِ الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جس کے مسلمان حامل ہیں۔

جواب: یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص بننے

کی ضرورت ہے۔ لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور جسم واحد بن کر اس کے لئے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لئے ہم کو نصب العین اور طریق کار دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ ——— یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جا سکتا۔

اعتراض: آپ نے بلاضرورت جو ضمنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک گذشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے، اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو

مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہو گئے، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب: مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدتِ ملّی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دُنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دُنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر قائم نہیں ہے، بلکہ نسل اور رسم و رواج کی وحدت پر مبنی ہے، اس لئے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لئے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں کیونکہ یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حصانت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اُٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا، اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغربی استیلاء سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں ۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب زوال کے، ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔

اعتراض: ۔ نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دوراز کار ہے ۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، وہ سب مل کر مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دار و مدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اُس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی ۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ۔ اس لئے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادّہ پیدا کریں، اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے استعمال کر سکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی۔

جواب: ۔ درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیش نظر ہے ۔ ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہمارے یہ عوام جن کو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، جن کو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لئے کوئی نظام موجود نہیں ہے، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دور رہنے کی بدولت ہندوستان کی آبادی کے سواد اعظم میں ہم رنگ ہو گئے ہیں، کہیں یہ اشتراکیت اور نزاعِ طبقات کی اُس تبلیغ کا شکار نہ ہو جائیں جو آسوقت "قوم پرست"

جماعت کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے ان پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جدا کر دے گی، معاشی کشمکش برپا کر کے ان کے درمیان عداوت ڈال دے گی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہل دماغ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے تو ان کی جہالت اور ان کے افلاس سے فائدہ اٹھا کر انہیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائے گا، اور اس بہانے سے ان کو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک "قوم پرست" تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے مسلم عوام ان کی تبلیغ کو سننے تک کے روادار نہ تھے، اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہوتا نظر آتا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کر سننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیل مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ اُن اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس لئے ہمارے عوام رفتہ رفتہ ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں گے اور آخر کار یہ چیز امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دینے، اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سواد اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہو گی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں، کل وہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی اور ایسی حالت میں آئے گی کہ اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہو گا۔ اُس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھلیں گی اور انہیں معلوم ہو گا کہ جو تیر انہوں نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ کی امت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سدِ باب اگر کسی صورت میں ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں

میں ایک فعال جماعت ایسی اٹھ کھڑی ہو جو اپنے جمہور میں جا کر ایک طرف قرآن کے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے، رسوم جاہلیت کو مٹائے، ان کو اسلامی تہذیب و تمدن کے اصولوں سے باخبر کرے، اور دوسری طرف ان کی روٹی کے مسئلے کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری اور ناجائز اغراض رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں۔ بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونے کی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں ہمارے سامنے اس وقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لئے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لئے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیئے۔ خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کئے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لئے نہ تھے بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کے لئے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھئے

دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لاسکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفانوں میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لئے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور اہواء نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

اعتراض: آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے آئینی ضمانتوں کو بیفائدہ قرار دیتے ہیں اس بنا پر کہ جب تک ان ضمانتوں کی پشت پر کوئی (SANCTION) نہ ہو اکثریت ان کی پابندی کے لئے مجبور نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں مگر بعینہٖ وہی اعتراض آپ کی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہوگی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف

نافذ کر سکے گی ؟ فرض کیجئے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی یک قلم موقوف ہو جائے۔ مسلمانوں کی یہ "سلطنت در سلطنت" اس کو کیسے روک سکے گی ؟ فرض کیجئے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے۔ آپ اس کو رجم کی سزا کیسے دے سکیں گے ؟ فرض کیجئے کہ آپ حد زنا جاری کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبین زنا کے ساتھ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں ؟

جواب :۔ "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اُس نظام کی مضبوطی اور اُس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دُنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اِسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزارگنی زیادہ اکثریت پر حکمران ہیں۔ ایک جمہوری نظام حکومت میں بھی "اقتدار اکثریت" (MAJORITY RULE) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں، کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہئے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

اعتراض:- آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہوگا وہ بھی تو شبہ دارالاسلام ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب بھی نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں کے بین بین جو صورت بھی ہو اس پر شبہ دارالاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیئے ۔

جواب:- "شبہ دارالاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دارالکفر" کی بہ نسبت خالص "دارالاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے، جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں اور جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ ان کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس محدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلاواسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ ان مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے جنکی بجاآوری

میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اُس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لئے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور اُن کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدارِ مطلق فی نفسہٖ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لئے اسے شبہ دارالکفر کہنا چاہیئے نہ کہ شبہ دارالاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیئے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائے گی اور پوری طرح مستحکم ہو جائے گی اس

وقت ہمارے لئے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑے گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لئے اس کی بندشوں میں سے چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دار الکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں۔ محض عقل عام (COMMON SENSE) رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لئے بھی دلائل کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لئے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دار الکفر ہو یا خالص دار الکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیئے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے

مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں +

اعتراض :- آئینی ضمانتوں پر تو بہرحال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا سکتا ہے ، اور یہ ایک قابل عمل چیز نظر آتی ہے، لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تو تخیل ہی ایسا ہے جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی اکثریت ۔ یہ نام درمیان میں آجانے کے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے ۔

جواب :- اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں ، اس کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے ۔ آئینی ضمانتیں ، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو ۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو ، تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا ، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے ، اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں +

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم کئے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی ۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے ، خواہ کوئی

اس پر راضی ہو یا نہ ہو +

اعتراض :- یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے بھی تو مفید نہیں ہے۔ اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو فی الواقع ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی جگہ فرقہ وارانہ انارکی لے لے گی +

جواب :- مَیں اپنے نصب العین والے مضمون میں اُن کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ آپ اس مضمون کو غور سے دیکھئے۔ اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کونسی چیز ایسی ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لئے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشوو ارتقاء میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لئے اس قسم کی خود اختیاری (AUTONOMY) حاصل کر لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظامِ حکومت بخوبی چل سکتا ہے +

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات THEORITICAL POLITICS

کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سُن کر کان کھڑے کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر سلطنت در سلطنت کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے، اور سیاسی انصاف کیلئے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے سلطنت در سلطنت سے محروم ہو گئے ہیں وہاں ظلم اور بے انصافی کا دور دورہ ہے۔ علاوہ بریں واقعات اسکا ثبوت دیتے ہیں کہ سلطنت در سلطنت ناقابل عمل چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کو ترقی میں یہ اگر حارج ہو سکتی ہے تو صرف اُس صورت میں جبکہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی نظامات ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرز عمل اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت مطلوب نہیں ہے جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص دارالاسلام سے کم جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو، ثانیاً ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصول تہذیب اور مصالح قومی کے خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے، اور ثالثاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے بے بس نہ ہوں کہ اپنی اجتماعی طاقت سے اس کو روک نہ سکیں ——— یہی تین عناصر مل کر اُس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں جسے میں "سلطنت در سلطنت" سے تعبیر کر رہا ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو تو اس سے کوئی

بدنظمی واقع نہیں ہو سکتی ۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ جب ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے ، اور اس کی خوش حالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے ، اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہئے کہ وہ اپنی اُن چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے جنہیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو ۔

اعتراض :۔ آپ کے انداز تحریر سے خوف و ہراس کی بُو آتی ہے ۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے ۔ کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں ؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلّت پر ہے ؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان اُن مشرکین سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں ؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے ۔ اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے ۔ اس کے اندر ایمان کی حرارت ہے ۔ کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں ؟ مسلمانوں کو اپنی طاقت پر اعتماد ہونا چاہئے ، اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہئے ۔ اگر ان میں عزم اور ہمت ہو تو کسی قوت سے بھی انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ ان پر دوسروں کا رنگ کیا چڑھے گا ۔ ان کے پاس تو صبغۃ اللہ

ہے جو تمام رنگوں پہ غالب آنے والا ہے ۔

جواب :- یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر اُن لوگوں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جنہیں سوچنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنہیں قرآن نے قوموں کے اسبابِ زوال و فنا میں شمار کیا ہے۔ قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اس بنا پر دُنیا میں غالب ہوں گے کہ ان کے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے کہ وہ شیام سندر یا ابرشن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گذشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اس کے جھوٹ کا زندہ ثبوت ہوتا (معاذ اللہ) یہ قرآن رکھنے والے موحد مسلمان جن کا آپ ذکر فرما رہے ہیں چین سے لے کر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مگر کیا یہ چین کے بُت پرستوں سے، روس کے ملحدوں سے، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے۔ مگر کیا یہ وہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا نہیں دیے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد فتنۂ تاتار کے زمانے میں بھی تھے۔ مگر کس چیز نے ان کی تہذیب اور ان کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے

ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؟ یہ دُنیا حقائق کی دُنیا ہے۔ خوابوں کی دُنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپ کو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پُتلے غیب سے پیدا ہوں گے اور کفار کو تہ تیغ کر دیں گے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپ کے پاس آیا ہوا ہے جس کا بس گھر میں موجود ہونا ہی اُسے تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ کر دے گا اور قانونِ فطرت کو آپ کے لئے بدل ڈالے گا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور وہ تمام قومی امراض اپنے اندر پالتے رہیے جو کفار و مشرکین اور منافقین کے خصائص میں سے ہیں، اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھیے کہ ہم وہی مومن ہیں جن سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کیا گیا تھا، اور جب کوئی یاد دلائے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے، تو اُس کو بُزدلی کا طعنہ دیجیے۔ یہ اگر بہادری اور عقل مندی ہے، تو ایسی بہادری اور عقل مندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ مَیں تو اسے خام خیالی اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ مَیں اُس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جو شیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے۔ یقیناً کَمْ

مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً ایک حقیقت ہے۔ مگر کچھ سوچا بھی ہے کہ وہ کون سی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعتِ امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جدوجہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جس کے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جس کے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ ہیں تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دُنیا کے کفار مل کر بھی آپ کو مٹا نہیں سکتے۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں؟ اگر ایسی اقلیت آپ تھے تو یہ تین لاکھ انگریز ۶ ہزار میل کے فاصلے سے آکر آپ کے آٹھ کروڑ افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟ بچوں کی طرح خواب نہ دیکھئے۔ ہوش میں آکر اس دماغ سے بھی کچھ کام لیجئے جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے ہی کے لئے دیا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر آپ نے خدا پر کوئی احسان کیا ہے جس کے معاوضہ میں وہ آپ کے لئے تمام قوانین طبیعی کو الٹ دے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کے لئے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے،

اور وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ نصب العین نہیں، کوئی صاحب امر شخص یا جماعت نہیں جس کی آپ اطاعت کریں۔ آپ کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہو رہی ہیں۔ کبھی جھانسی میں اور کبھی بجنور میں اور کبھی مراد آباد میں خانہ جنگی کے لئے آپ کے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں۔ خم ٹھونک ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے تو اغیار کے سامنے اپنی برادر کشی پر سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپ کے افراد، اور نامور افراد کیرکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اس گروہ میں ہیں تو کل دوسرے گروہ میں۔ آج یہ طاقت غالب ہے تو اس کے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھرتی نظر آئی تو دفعتہً انہوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رُخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپ کی جمعیتوں تک کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم خواہ کوئی طرز عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں ان کی مخالف ہوں گی تو دو چار ان کا ساتھ دینے کے لئے بھی کھڑی ہو جائیں گی، اور یہ حقیقت دُنیا پر آشکارا کر دیں گی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ قومی سیرت ہے جس کو لے کر آپ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کے لئے كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً کا معجزہ صادر ہوگا؟

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلے گا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائے گا، اور جو اس کی شرائط پوری کرے گا، خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہوگا۔ صحابۂ کرام کی جماعت سے بڑھ کر ایمان کی حرارت اور سیرتِ اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جب کہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے اور بنفس نفیس ان کی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگ اُحد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آگئی اور انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں پر چیرہ دست ہو گئے اور خود رسولِ خدا ان کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ حَتّٰی

إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ..... إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ

(آل عمران: رکوع ۱۶) جنگ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ قانونِ فطرت نے اس کی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلے میں ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ

أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ

(التوبہ:- رکوع ۴)، جو خدا ایسے بے لاگ قانون کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اگر اُس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہل ایمان کی صفات سے عاری ہونے کے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا، اور اُن مشرکین کے مقابلے میں آپ کو ثابت قدمی بخشے گا جو اس کے قانونِ طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو مَیں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقلِ سلیم اور علمِ قرآن دونوں سے محروم ہیں +

(کتبہ:- محمد رمضان خوش نویس عتیق خوش نویساں اندرون لوہاری دروازہ لاہور)